اُردو ریسرچ جرنل "تشکیل" جلد:3، شمارہ:2(جولائی تا دسمبر 2025ء)
ISSN (Online): 3007-3294, ISSN (Print): 3007-3286, HEC Recognized Y-Category Journal

ڈاکٹر سمیرا ملک
پی ایچ ڈی اُردو، شعبہ اُردو زبان و ادب، نمل، اسلام آباد
ڈاکٹر ظفر احمد
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو زبان و ادب، نمل، اسلام آباد

ممتاز شیریں کی تنقید میں منٹو ایک اخلاقی فنکار: متن اساس مطالعہ

Dr. Sumaira Malik
Ph.D Urdu, Department of Urdu, NUML, Islamabad
Dr. Zafar Ahmad
Assistant Professor, Department of Urdu, NUML, Islamabad

Manto as a Moral Artist in Mumtaz Shirin's Criticism: Text Based Study

ABSTRACT
Text Based Criticism is a literary approach that focuses on detailed analysis of a work's qualities, both positive and negative regardless of its external factors. This type of criticism examines the inherent merits and flaws of a text, exploring its virtues and vices and the underlying causes for these characteristics. It establishes a relationship between the work and the reader, helping to interpret the meaning and significance of the text. Mumtaz Shirin is highly regarded, especially among female critics, for her contributions to Urdu literary criticism. Among the prominent critics in Urdu literature, Shirin stands out, particularly for her in-depth studies of Saadat Hassan Manto's works. In her essays, she meticulously analyzed Manto's political, moral, and social ideas, which were central themes in his writings, especially in his short stories. In this article, an attempt is made to draw basic conclusions after text-based study of Shirin's essays on Manto.

Keywords: *Text-Based Criticism, Mumtaz Shirin, Saadat Hassan Manto, New Criticsm, Female Critics, Moral Artist, Manto Noori na Naari*

انسان کائنات کی وہ ممتاز مخلوق ہے جسے ربِ کائنات نے عقل و شعور کے اعلیٰ درجے عطا فرمائے ہیں جنھیں بروئے کار لاتے ہوئے انسان نے ایک معاشرتی نظام قائم کر رکھا ہے جو اب پیچیدگی کا حامل ہو چکا ہے۔ یہی سبب ہے کہ کوئی فنکار اس وقت تک حقیقی عظمت کا حامل نہیں گردانا جاتا جب تک وہ اپنے تخلیقی سوالات کے ذریعے معاشرے کی پوشیدہ اور تلخ حقیقتوں کو بے نقاب نہ کر دے۔ اُردو ادب کے دائرۂ تحقیق و تنقید میں متعدد ایسے جید فنکاروں نے جنم لیا جنھوں نے معاشرتی حقائق کو ادبی اسلوب میں پیش کر کے ادب کو فکری وقار عطا کیا۔ اس تناظر میں بیسویں صدی، بالخصوص اس

کی چوتھی اور پانچویں دہائیاں، اُردو ادب کی تخلیقی اور تنقیدی روایت میں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہیں۔ تخلیق کے میدان میں سعادت حسن منٹو اور تنقید کے شعبے میں ممتاز شیریں، اُردو ادب کی ایسی درخشندہ مثالیں ہیں جو فکری گہرائی، جراتِ اظہار اور ادبی بصیرت کی مظہر ہیں۔

فن کار کی حیثیت سے منٹو ایک متنازع ادیب رہا ہے۔ اس کی انقلابی، سماجی اور اخلاقی اقدار کسی نہ کسی طور، نہ صرف اس کی زندگی میں اس کے لیے تنازعات کا باعث بنتی رہی ہیں بلکہ اس کے مرنے کے ساٹھ ستر برس بعد بھی اس کے افسانے اور تحریریں تنازعات کے کٹہرے سے بری نہیں ہو سکیں۔ منٹو اور اس کی تحریروں سے مخالفت کا یہ رویہ اس بات کا ثبوت ہے کہ منٹو بہ حیثیت فن کار آج بھی زندہ ہے۔ اس کی تحریریں آج بھی اسی طرح معاشرے کے اثر و رسوخ کی خلاف ورزی کرتی نظر آتی ہیں جس طرح ماضی میں کرتی رہیں۔ منٹو کے تلخ موضوعات کی بااثر لوگوں کے علاوہ اُردو ادیبوں اور ناقدین نے بھی مخالفت کی لیکن دوسری جانب ایسے بھی بہت سے فن کار، ادیب اور نقاد گزرے ہیں جنھیں منٹو کا باغیانہ رویہ حق بجانب لگا؛ گو کہ انھوں نے شروعات میں منٹو کا اس طرح ساتھ نہیں دیا جس طرح دینا چاہیے تھا لیکن منٹو کے جانے کے بعد نہ صرف ان ادیبوں اور ناقدین نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا بلکہ منٹو کی بابت اٹھنے والے سوالات کے حقائق پر مبنی جوابات بھی دیے، اس کی ایک مثال ممتاز شیریں بھی ہیں۔ اس سے اختلاف رکھنے والے ناقدین اور فنکاروں کے حوالے سے اس موضوع پر ممتاز شیریں نے اپنے مضامین پر مشتمل کتاب 'منٹو نوری نہ ناری' میں بالواسطہ منٹو کی وکالت تو نہیں کی مگر اپنی اس نامکمل کتاب میں اپنی تحریروں اور کتاب کے اس عنوان سے انھوں نے اپنے دور اور بعد میں آنے والے ناقدین کے لیے یہ سوال ضرور نمایاں کیا ہے کہ منٹو کے خلاف بولنے اور لکھنے سے پہلے اس کے نظریہ انسان، اقدار اور اخلاقیات کو ضرور سمجھ لیں۔ ممتاز شیریں نے اپنی تنقید میں منٹو اور اس کی تحریروں کو کس نظریے کے تحت پرکھا؛ اس کا احاطہ متن اساس تنقیدی تھیوری کے تناظر میں زیر نظر مضمون کا موضوع ہے۔

ادبی تنقید کی کوئی بھی قسم یا دبستان جس کا تعلق بامعنی تحریر سے ہو، اس میں اس تحریر کے محاسن اور معائب کی توسیع، ان کی قدر و قیمت کا تعین اور اس کے حسن و قبیح کو اس کے اسباب کے ساتھ پیش کیا جائے، متن اساس تنقید کہتے ہیں۔ متن اساس تنقید ایک تجزیاتی عمل ہے جس کا تعلق ادبی تنقید کی ہر اس شاخ سے جڑا ہے جو تخلیق اور قاری کے مابین تفہیم کا رشتہ قائم کرتی ہے۔ اس تناظر میں مشرق و مغرب کے ناقدین نے اپنے اپنے نظریات کی روشنی میں متن اساس تنقید کی وضاحت پیش کی ہے جس میں اس کی شرائط، اصول، تعریف اور طریقہ کار شامل ہے۔ اگرچہ متن اساس تنقید کا بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق تنقیدی دبستان، ساختیات، پس ساختیات اور متنی تنقید سے ہے مگر متن اساس تنقید میں ہم جملے کی تشبیہ اور استعارے یا ساخت کی روایتی بحث نہیں کرتے بلکہ متن اپنے اُسلوب کے ذریعے کس

بنیادی نقطے کی نشاندہی کرتا ہے اس پر بحث کرتے ہیں۔ جملے کی باقاعدہ ساخت اور الفاظ کی ترکیب، صرفی و نحوی ساخت اور لسانی تشکیلات کی بحث، متن اساس تنقید کا حصہ نہیں بلکہ اُسلوبی اعتبار سے مصنف کا لکھا مکمل جملہ یا تحریر جو متن کے درجے پر فائز ہے، اس مفہوم کی نشاندہی کرنا اس تنقید کا مقصد ہے۔

مغربی تنقید کے حوالے سے اس تنقیدی (متن اساس تنقید) کے بنیاد گزاروں میں ایلیٹ کے بعد نمایاں نام "دریدا" کا ہے (Jacques Derrida 1930-2004) جو ایک فرانسیسی فلسفی تھا۔ دریدا متن کی تفہیم اور اس پر تنقید کرنے والوں میں سر فہرست ہے۔ متن کی اساسی فکری موقف کی بنیاد پر دریدا نے متن سے متعلق چند ایسی خوبیوں کی طرف توجہ دلائی ہے جو کہ مستقل نوعیت کی ہیں، جو متن میں اجزاء کے افتراقی ارتباط سے اس میں معنی خیزی کی ایک مسلسل حالت طے کرتی ہیں اور جو معنی کے یک سمتی استقلال کو ناممکن بنا دیتی ہے اور متن معنی خیزی کی فعال قوت کے حوالے سے بحال ہو جاتا ہے۔ معنی کے اس عدم تعین کے لیے انگریزی میں اصطلاح undecidability رائج ہے۔ "متن کی پیچیدگی اس کے اطلاق کے سبب نہیں بلکہ Signifiers کے باہم افتراقی ربط کے ہمہ جہت تحرک کے سبب ہے۔ یہ بنیادی بحث متن اساس تنقید کی شروعات کرتی ہے۔"(1)

یہ بات اس حوالے سے خاص ہے کہ اُردو تنقید کے ضمن میں خاص طور پر فکشن پر لکھی گئی ناقدانہ رائے میں پس ساختیاتی فکر باقاعدہ گفتگو کا موضوع بن ہی نہیں سکی۔ اس لیے تھیوریز یا نظریاتی فکر پر تو تنقید کے پیشتر حوالے ملتے ہیں مگر متن اساس تنقید کے حوالے سے اس طرح کی بحث نہیں ملتی جس طرح ساختیات، پس ساختیات کو متن سے مشروط کر کے ملنی چاہیے تھی اور اس کی اُردو تنقید میں اب بھی ضرورت ہے۔ مغربی ناقدین میں "دریدا" کے اس نظریے کے پیروکاروں میں جوڈتھ بٹلر (Judith Butler)، گائتری چکراورتی (Gayatri Chakravorty)، جین لوس نینسی (Jean Luc Nancy) اور ایڈورڈ سعید (Edward Said) کے نام نمایاں ہیں۔

دریدا نے متن کی تفہیم کو ایک نئے زاویے سے تنقید کا حصہ بنایا جس میں اس نے فرڈی نینڈ ڈی سوسیئر کے لسانی تصور سے متعلق فکر کو پلٹ کر رکھ دیا۔ اس کے نزدیک متن کی معنی خیزی ایک جاری عمل ہے۔ اس لیے اس میں یک جہتی اور حتمی معنی کی منزل کبھی نہیں آتی۔ اس کے نزدیک زبان میں معنی تو خود اس کی اکائیوں کے باہم منفی ارتباط سے تشکیل پاتے ہیں دریدا، سوسیئر کے کسی موجود Signified سے بھی انکار کرتا ہے۔ اس کی اسی بصیرت نے تنقیدی حوالے سے ادبی تھیوری کو ایک بالکل نئی جہت سے متعارف کرایا جس میں مصنف زبان کا حاکم و متصرم نہیں، خود زبان کا پابند ہے۔ وہ معنی تخلیق نہیں کرتا بلکہ متن میں اکائیوں کے باہم ارتباط سے معنی خیزی کی وہ جہات کھلتی جاتی ہیں جن سے متن بنانے والا خود بھی واقف نہیں ہوتا اور متن میں زبان کے اس تفاعل کا ادراک ہی قرات کا اصل وظیفہ ہے۔ اس کی وضاحت قاضی افضال کا یہ ترجمہ کرتا ہے۔ بہ قول دریدا:

"مصنف ایک زبان میں ایک منطق کی حدود میں لکھتا ہے جس کے مخصوص نظام، قوانین اور (متن کی) زندگی پر مصنف پوری طرح حاوی نہیں ہو سکتا۔ وہ خود کو اس نظام (System) کے حوالے کر کے ہی صرف ایک طرز / طریقہ تک اور صرف ایک حد تک استعمال کر سکتا ہے اور متن کی قرات لازماً ان رشتوں کی دریافت پر نظر رکھے گی جو مصنف کی نظر میں نہیں تھے یا جو اس کے احاطہ اختیار میں نہیں تھے (اجزاء کا) یہ ارتباط، روشن اور سائے یا قوت وار کمزوری کی متعین شماریاتی تقسیم جیسا نہیں ہے بلکہ معنی خیزی کی ایک وضع ہے جسے تنقیدی قرات کو دریافت کرنا ہے۔"(2)

دریدا کے نزدیک متن کا تجزیہ یا اس کا مطالعہ کسی بھی نوعیت کا ہو اس مطالعے یا تجزیے کو اس کے غیر لسانی یا تاریخی یا پھر اس کے معاشرتی حوالے سے آزاد ہونا چاہیے۔ دریدا کے نزدیک اس صورت میں عام طور پر ہم متن پر اپنے ان معنوں کو نافذ کرتے ہیں جو اس عہد کی Common sence زبان کی گرامر کی مدد سے مرتب ہوتا ہے جب کہ متن کو معنی کی بجائے اس کی معنی خیزی کی قوت کے نقطہ نظر سے پڑھا جانا چاہیے تاکہ اس کے اجزاء کے ارتباط سے نمو کرنے والی تمام جہتوں کو کھولا جا سکے۔ لیکن اس اعتبار سے متن کی قرات خود ایک نظری مسئلہ بن جاتی ہے۔

قاضی افضال کے نزدیک اگر متن کو اس طرز سے پڑھا جائے تو مطالعے کے دوران قاری یا نقاد کی توجہ مدلول معنی یا حوالے کی بجائے اس کے Signifier کے ارتباط پر رہتی ہے جس کے متعلق رولاں بارتھ نے کہا تھا کہ تھیوری اصل میں کوئی تجرید نہیں بلکہ Reflexivity ہے جس میں کوئی شے خود اپنی طرف لوٹ آتی ہے اور ادب میں کسی تھیوری خصوصاً ادبی تھیوری میں "خود انعکاسیت" (Self reflexivity) کہتے ہیں یعنی جس زبان کے ذریعے متن کی معنی خیزی کی نمو ہو۔(3) قاضی افضال تنقیدی حوالے سے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اب کسی بھی ادبی فن پارے پر تنقیدی حوالے سے بحث کرنے کے لیے صرف فلسفانہ یا نفسیاتی بحث اس امر کا فیصلہ کرنے سے قاصر ہے۔ ادب میں کھرے کھوٹے کا لفظ تنقیدی تناظر میں قابل استعمال ہے ہی نہیں اور کسی بھی ادبی فن پارے کی تنقید اس کے متن کے تجزیے کے بنا ادھوری ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ناصر عباس نیر کے اس تجزیے کو بھی مد نظر رکھا جائے کہ متن کو سمجھنے کے لیے اس کے سیاق اور تناظر کو جاننا ضروری ہے۔ متن اساس تنقید کی بحث ناصر عباس نیر کی کتاب "متن و سیاق اور تناظر" میں تفصیل سے درج ہے، جہاں جملے کی ساخت اہمیت کی حامل ہے وہی جملے کا تناظر اور اس کا سیاق بھی اس کے مفاہیم کی اصل تک جانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اگرچہ سیاق اور تناظر کا متن سے گہرا تعلق ہے مگر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ سیاق اور تناظر دونوں کا تعلق بہر حال لکھنے والے یعنی مصنف سے ہے۔ سیاق بھی مصنف کی طرف سے متن کا حصہ بنتا ہے اور تناظر بھی مصنف کی ہی تخلیق ہے۔ دونوں کی تعبیرات میں فرق نمایاں ہے کہ سیاق سے

جڑی تعبیر یا متن ایک سائنسی نقطہ نظر سے متن کے معنی اخذ کرتا ہے جب کہ "تناظر" میں نئے امکانات کی تخلیق ہوتی ہے لیکن دونوں کی جڑیں مصنف سے جڑی ہیں۔ اس کے برعکس متن اساس تنقید کے حوالے سے دریدا کا یہ نقطہ نظر ہے کہ جو بھی متن کو تخلیق کرتا ہے وہ بیک وقت اس متن کے تمام امکانات پر حاوی نہیں ہوتا، نہ ہی ہو سکتا ہے۔ اس لیے وہ کوئی مضمون ہو یا کوئی بھی الفاظ کو تحریر کرتا ہے اس متن میں "معنی یا تعبیر" کے کئی پہلو ایسے ہوتے ہیں جو متن بنانے والے کا مقصود ہر گز نہیں ہوتے، ممکن ہے کہ جو معنی پڑھنے والا اخذ کرے وہ متن تخلیق کرنے والے کے وہم و گمان سے بھی نہ گزرے ہوں۔ ناصر عباس نیر نے اپنی کتاب 'متن، سیاق اور تناظر' میں اسی عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جس میں انھوں نے متن کے قدیم اور جدید تصور، سیاق متن پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے اور متن کے مطالعے سے منشائے مصنف کا اندازہ کس طرح لگایا جاسکتا ہے پر تفصیلی بحث کی ہے۔ مزید تفصیل کے لیے اس مضمون کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

رواں بارتھ کی توضیح میں متن کے تین بنیادی نکات ہیں۔ کسی بھی متن میں مختلف جہات پائی جاتی ہیں جو متن کی مکانیت ان جہات کو ایک جداگانہ شناخت بھی دیتی ہے۔ مگر جہات کی کثرت متن کی مکانیت کو "پابند نظام" نہیں بننے دیتی۔ متن کی جہات دراصل وہ مختلف تحریریں ہیں جنھیں نہ تو متن نے خود اور نہ ہی مصنف نے سو فیصد خود سے خلق کیا ہوا۔ چنانچہ اس قسم کی تحریروں میں جو تکرار اور جلوے رونما ہوتے ہیں وہی نئے معنی کا سبب بنتے ہیں یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ متن مصنف سے ہی تخلیق ہوتا ہے یہ الگ بات ہے کہ وہ متن جن معانی کا حامل ہے وہ کلیتاً مصنف کی اپنی بلا شرکتِ غیر تخلیق نہیں ہوتے بلکہ وہ ان کے تمام ثقافتی، لسانی نشانیات سے لے کر ادبی روایت کو محیط ہے جسے کوئی مصنف محض وراثت میں حاصل کر کے، ارد گرد سے لاشعوری طور پر قبول کرتا اور ذاتی کوشش سے اپنی داخلی شخصیت کا حصہ بناتا ہے۔ ناصر عباس نیر اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> "یہاں ایلیٹ کے تصور روایت کی طرف دھیان جاتا ہے مگر بارتھ اور ایلیٹ کے تصور میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ایلیٹ، روایت کا تصور ادب تک محدود رکھتا ہے اور اس سے اخذ کرتا ہے جب کہ بارتھ کا تصور ثقافت کی مجموعی نشانیاتی نظام تک پھیلا ہوا ہے۔ گویا ایلیٹ کے نزدیک ادبی متن کے معنی کا سرچشمہ فقط وہ ادبی روایت ہے جسے مصنف نے انتساب کیا ہے اور بارتھ کی نظر میں متن کے معنی کے منابع ثقافت کے بے شمار مراکز ہیں جو اس ثقافت کا حصہ ہونے کی بنا پر اس کے وجود کا حصہ بن جاتے ہیں۔"(4)

متن کو پڑھنے کے لیے اس امر کو بھی مد نظر رکھا جائے کہ متن کو پڑھتے ہوئے اس سیاق اور اس کے تناظر دونوں طریقوں سے الگ الگ پرکھا جائے تو بہت حد تک ممکن ہے کہ متن کی تفہیم کے نئے زاویے سامنے آئیں گے لیکن اس

کے ساتھ ساتھ اس حقیقت سے کسی صورت انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ متن کے معنی نشریات، تفسیر اور تعبیر، کوئی بھی صورت ہو پڑھنے والے کے لیے ایک زاویہ نظر لے کر آئے گی اور پڑھنے والا جب اس پر اپنی رائے دے گا تو تنقیدی حوالے سے وہ صحیح ہو یا غلط، تنقید کے زمرے میں شمار ضرور ہوتی ہے کیونکہ ہر نقاد کا تناظر تحریر کی تعبیر کو بدل دیتا ہے اس حوالے سے سٹیفن پاپ ایک جرمن نقاد Riidigar Zymer کے لیے لکھتا ہے:

> "As the word context is ambiguous in ordinary speech context will refer to that written context that appears immediately at the side of a text and context to the wider range of references that the text referes to but are not part of the text itself." (5)

متن اساس تحریر، تنقید کے حوالے سے ناصر عباس نیر کا مضمون "معنی کی کثرت" جو ان کی کتاب متن، اساس اور تناظر" میں شامل ہے، میں بھی اس تنقیدی نظریے کی بالواسطہ بحث شامل ہے۔ اس کے علاوہ جاق دریدا کا مضمون Act of Literature بھی اس موضوع کی واضح عکاسی کرتا ہے۔ پال دی مان (Paul the man) کا مضمون Semiology and Rhebric بھی اس موضوع کی واضح بحث کرتا ہے کہ متن اساس تنقید ایک قاری اور مصنف میں رابطے کا کردار ادا کرتی ہے۔ بنیادی طور پر کسی تحریر کا صحیح ابلاغ اس کے متن کی وجہ سے ممکن ہوتا ہے لیکن کوئی بھی تحریر تخلیق کے وقت تمام محرکات کے اشتراک سے وجود میں آتا ہے۔ گویا اس تنقیدی نظریے میں تناظر کوئی بھی ہو متن کی ہر تعبیر متن کی طاقت کا سرچشمہ ہوتی ہے اور ہر تعبیر کے ساتھ متن کی قوت حیات بڑھتی جاتی ہے۔ بقول ناصر عباس نیر:

> "دنیا میں صرف وہی متن کامیاب ہوتے ہیں جو قرات و تعبیر کے مسلسل و متحرک عمل کی زد پر رہتے ہیں اور نتیجتاً داخلی سطح پر نئی تنظیم حاصل کرتے رہتے ہیں۔ ہر نئی تعبیر متن کے نظام معنی کا باقاعدہ اور نامیاتی حصہ بن جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ یادگارِ غالب میں ظاہر ہونے والا متن غالب، تفہیم غالب میں پیش ہونے والے متن غالب سے مختلف اور ممتاز ہے"۔ (6)

ناصر عباس کے اس کوڈ سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ ایک متن کی تعبیر ایک سے بہت زیادہ ہو سکتی ہے اور یہ ہی متنوع تعبیریں، تفسیریں اور مفاہیم متن اساس تنقید کے زمرے میں آتے ہیں۔ اس حوالے سے ممتاز شیریں کے مضامین کو دیکھا جائے تو انھوں نے اپنی تنقید میں منٹو کے سیاسی، اخلاقی اور سماجی افکار جو اس کی تحریروں بالخصوص افسانوں میں نمایاں تھے، انھیں اپنے تنقیدی مضامین کا موضوع بنایا۔

بیسویں صدی سے تاحال اُردو ادب میں ممتاز شیریں کو بحیثیت نقاد ایک بلند مرتبہ حاصل رہا۔ بالخصوص خواتین ناقدین میں ممتاز شیریں کے ہم پایہ کوئی خاتون نقاد اب تک اپنا وہ مقام نہ بنا سکی جو شیریں نے چند برسوں میں حاصل کر لیا۔ اگر زندگی نے وفا کی ہوتی تو ممتاز شیریں آج صفِ اول کے نقادوں میں شمار کی جاتیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد ممتاز شیریں ایک منفرد تنقیدی لہجے کے ساتھ منظرِ عام پر آئیں، اور بطور نقاد انھوں نے ایسی مثال قائم کی جس نے اُردو تنقید کو نئی جہات سے روشناس کروایا۔ ان کے تنقیدی مضامین نہ صرف فکری و فنی گہرائی کے حامل تھے بلکہ تنقید کے میدان میں انھوں نے خواتین کے لیے ایک نئی راہ متعین کی۔ ممتاز شیریں کی ادبی کاوشوں نے پاکستانی خواتین کو محض فکشن اور شاعری تک محدود نہیں رہنے دیا، بلکہ تنقید جیسے سنجیدہ اور دقیق میدان میں بھی نمایاں مقام حاصل کرنے کا حوصلہ عطا کیا۔ اُن کی شخصیت اور کام نے یہ ثابت کیا کہ تنقیدی بصیرت محض صنف کی پابند نہیں بلکہ فکر، علم اور اظہار کی معیاری بلندی پر منحصر ہے۔

تنقید کے میدان میں اس دور کی دیگر خواتین بھی اہم کردار ادا کرتی رہیں جن میں صفیہ اختر، ڈاکٹر رفیہ سلطانہ کے علاوہ صالحہ عابد حسین، زرینہ ثانی، رضیہ اکبر، منصورہ ستی، عطیہ پروین عالم، حمیرا جلیل، شفیق النساء قریشی، ڈاکٹر ذرینہ عقیل، ثریا حسین اور ڈاکٹر امِ ہانی اشرف کے نام شامل ہیں لیکن ممتاز شیریں نے تنقید کے میدان میں کسی کو خود سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ نہ صرف اس دور کی بلکہ عصر حاضر کی خواتین نقاد بھی ممتاز شیریں کی تنقیدی بصیرت کو پار نہیں کر سکیں۔ ممتاز شیریں کے ادبی سفر کا آغاز ادبی صحافت سے ہوا۔ ابتدا میں وہ "نیا دور" کے نام سے ایک ادبی پرچے کی اشاعت کیا کرتی تھیں جو اُن کی فکری بصیرت اور تنقیدی رجحان کا پہلا مظہر تھا۔ ان سے قبل محمدی بیگم نے اصلاحِ نسواں اور تعلیمِ خواتین کے فروغ کے لیے ایک رسالے کا اجرا کیا اور ساتھ ہی تنقیدی مضامین بھی تحریر کیے، مگر ممتاز شیریں نے اس روایت کو ایک نیا زاویہ عطا کیا۔ جنوبی ہند کی ریاست آندھرا پردیش کے قصبے ہندوپور میں پیدا ہونے والی ممتاز شیریں نے اپنی ابتدائی زندگی وہیں بسر کی، تاہم ان کی ازدواجی زندگی کا آغاز بنگلور میں ہوا۔ تقسیمِ ہند کے بعد پاکستان کی جانب ان کا سفر نہ صرف جغرافیائی تبدیلی تھی بلکہ ان کی ادبی اور عملی زندگی میں ایک انقلابی موڑ بھی ثابت ہوا۔ انھوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز بنگلور ہی سے کیا، اور محض سترہ برس کی عمر میں صمد شاہین سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد ادب کو سنجیدگی سے اپنایا۔

ممتاز شیریں کی ادبی شخصیت ہمہ جہت تھی۔ وہ بیک وقت تنقید نگار، مترجم، افسانہ نگار، مرتب اور مدیر کی حیثیت سے اُردو ادب میں اپنا الگ مقام پیدا کر چکی تھیں۔ اُن کے والد اور شوہر دونوں نے ان کی علمی و ادبی سرگرمیوں کی بھرپور حوصلہ افزائی کی، جس کے نتیجے میں ممتاز شیریں کو کم عمری ہی میں ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل ہوئی۔ ان کا پہلا افسانہ ہی اُردو ادب کے مقتدر حلقوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ 1944 میں اپنے شوہر کے اشتراک سے "نیا دور" کے عنوان

سے ادبی رسالے کا اجرا کیا جو ان کے تنقیدی سفر کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا۔ اسی رسالے کے پہلے شمارے میں انھوں نے "1943ء کے افسانے" کے عنوان سے ایک تنقیدی مضمون لکھا جو ان کی فکری پختگی اور تنقیدی اندازِ نظر کا مظہر تھا۔ یہی مضمون اُن کی تنقیدی شناخت کا پیش خیمہ بن کر سامنے آیا۔ کرشن چندر، احتشام حسین، آل احمد سرور اور دیگر نے اس مضمون کی ستائش کی۔ اس حوالے سے حسن عسکری نے ممتاز شیریں کے بارے میں لکھا:

> "ممتاز شیریں ان چند لکھنے والوں میں سے ہے جن کی تعریف ہی ان کی شہرت سے شروع ہوتی ہے۔ انھیں مشہور ہونے کے لیے انتظار نہیں کرنا پڑا بلکہ پہلے ہی افسانے کے بعد ادب کے شائقین کی توجہ اپنی جانب مبذول کرلی۔"(7)

ممتاز شیریں نے تنقید نگاری میں "معیار" اور "منٹو نوری نہ ناری" نامی کتابوں سے شہرت حاصل کی۔ اپنی ان تحریروں میں انھوں نے خود کو ایک بے لاگ نقاد کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ تنقیدی حوالے سے وہ خود کو غیر جانب دار اور کسی مخصوص نظریے کی پیروکار نہیں سمجھتی اور خود کو اُردو ادب کی ترقی کی خواہاں کہتی، لیکن اس کے باوجود بھی ممتاز شیریں کی تحریروں میں ترقی پسندی کی مہک ضرور محسوس ہوتی ہے احتشام حسین ان کے تنقیدی مضامین کے حوالے سے اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "ممتاز شیریں صاحبہ کا طویل مضمون میں نے بڑی دلچسپی سے پڑھا۔ مجھے موصوفہ کی وسیع النظری اور مطالعہ کی کثرت پر حسرت ہوئی۔ پھر افسانہ نگاروں کا تجزیہ ان کے افسانوں کے متعلق پُر خلوص اور ناقدانہ رائیں یہ باتیں بہت دنوں میں آتی ہیں مگر افسانوں کے متعلق ان کے مضامین کو پڑھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان کی جگہ برسوں لکھنے والوں میں نہیں ہے۔"(8)

ممتاز شیریں کی تحریر میں اسلوبی تنوع پایا جاتا ہے۔ انھوں نے مغربی افسانہ، کشمیر، فسادات، اُردو ادب اور اُردو افسانے کی تکنیک پر اپنی کتاب "معیار" میں تفصیلی مضمون لکھے ہیں۔ افسانے کے حوالے سے انھوں نے منٹو کا سرسری ذکر ضرور قلم بند کیا لیکن باقاعدہ موضوع نہیں بنایا جب کہ اپنی دوسری کتاب "منٹو نوری نہ ناری" میں انھوں نے منٹو کے علاوہ اور کوئی موضوع رکھا ہی نہیں۔ پوری کتاب منٹو کے افسانوں پر مشتمل تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے۔ اسی کتاب میں منٹو کے افسانوں کے کرداروں اور منٹو کی نفسیات سے منسلک ایک مضمون بھی ہے جس کا عنوان "منٹو ایک اخلاقی فن کار" ہے۔ مصنفہ اس کتاب میں منٹو کے موضوع کو منتخب کرنے کا جواز بھی پیش کرتی ہیں۔

> "منٹو ایک سچا اور بے باک فن کار تھا۔ ایک آگ تھی جس میں وہ مسلسل تپتا رہتا تھا۔ منٹو کے افسانوں میں بلا کی جان ہے اور ان کا تاثر ہر طرح کے پڑھنے والے قبول کرتے ہیں۔

یوں تو میں نے بہت سے افسانہ نگاروں کا اپنے مضامین میں جائزہ لیا ہے یہاں یہ حاشیہ لگانے کی ضرورت ہے کہ ایک مدت تک منٹو کا جائزہ تو کیا اس کا نام بھی نوک قلم تک نہیں آنے دیا لیکن منٹو پر یہ کتاب لکھنے کا خیال اس لیے آیا تھا کہ میرے خیال میں منٹو ہمارا نمائندہ اور بہترین افسانہ نگار ہے۔"(9)

ظاہری طور پر دیکھا جائے تو سعادت حسن منٹو کا فن ہمیشہ سے مختلف تنازعات اور فکری مباحث کا مرکز رہا ہے۔ ممتاز شیریں نے بطور تنقید نگار منٹو کے افسانوں میں انسانی موضوعات کا آغاز انسانی اخلاقیات سے جوڑا ہے۔ ان کے نزدیک انسانی وجود سب سے پہلے ایک دینی تصور سے وابستہ ہوتا ہے، اور معاشرتی سطح پر اس تصور سے متعلق تمام بحثیں اسی دینی اساس کے بعد جنم لیتی ہیں۔ قدیم یونانی ادب میں انسان کو دیوتائی صفات کا حامل قرار دیا گیا، تاہم وقت کے ساتھ ساتھ ادب میں انسان کی حیثیت و مرتبہ کم ہوتا چلا گیا، حتیٰ کہ سموئیل بیکیٹ کے مشہور ڈرامے Waiting for Godot (1948) میں انسان ایک غیر اہم اور بے مقصد وجود کی علامت بن کر رہ گیا۔ ممتاز شیریں کے مطابق یہی تنزلی ادب کے مختلف ادوار میں انسانی مقام کی تبدیلی کو ظاہر کرتی ہے۔ اپنی تنقیدی بصیرت کے تحت ممتاز شیریں چند مغربی مصنفین کا حوالہ دیتی ہیں، لیکن بالآخر علامہ اقبال کے تصورِ انسان کو ادبیات میں انسانی مقام کی بلند ترین سطح قرار دیتی ہیں۔ اپنے مضمون "ادب میں انسان کا تصور" میں ممتاز شیریں نے منٹو کے خیالات کا تجزیہ کرتے ہوئے انھیں اقبال کے تصورِ انسان کی روشنی میں پرکھا ہے۔ اگرچہ اقبال کے زمانے میں انسان، خصوصاً مسلمان، جن اخلاقی و معاشرتی بحرانوں سے دوچار تھے، انہی حالات کو منٹو نے اپنے افسانوں کا مرکزی موضوع بنایا۔ مضمون میں ممتاز شیریں نے اقبال کے تصورِ انسان کو تفصیل سے بیان کرتے ہوئے اس بات کو اجاگر کیا کہ اقبال اور نطشے کے مابین بنیادی اختلاف اسی انسانی تصور پر مبنی ہے۔ نطشے کا انسان Superman ہے، جو غیر معمولی جسمانی و فکری قوتوں کا حامل ہے، جب کہ اقبال کا انسان روحانی بلندیوں کا طلبگار ہے۔ اقبال اپنے فلسفے میں نیابتِ الٰہی، اشرف المخلوقات، خودی اور عزم و ارادے کی طاقت کے ذریعے انسان کو اعلیٰ و ارفع مقام عطا کرتے ہیں—ایسا مقام جو اُسے کمزوری، بزدلی اور مجبوری کی کیفیت سے نکال کر عظمت کی بلندیوں تک پہنچاتا ہے۔ اسی لیے ممتاز شیریں نے انسانی تصور پر لکھے گئے اپنے مضمون میں اقبال کے تصورِ انسان کو بطور حوالہ پیش کیا اور منٹو کے انسانی موضوعات کو اسی تناظر میں پرکھا جس سے اُن کی تنقید کو فکری گہرائی اور نظریاتی استحکام حاصل ہوتا ہے۔

فکشن کے تناظر میں ممتاز شیریں انسانی تصور کو نیکی اور بدی کے مابین ایک مسلسل کشمکش میں مبتلا محسوس کرتی ہیں۔ اسی اخلاقی دورنگی کو انھوں نے "فاوسٹ" کے استعارے کے ذریعے پیش کیا ہے جو انسان کے دو رُخے کردار کی علامت ہے۔ یہ تصور جرمن ادیب گوئٹے (1749–1832) کے تخلیق کردہ کردار فاوسٹ میں نمایاں طور پر سامنے آتا ہے

اور بعد ازاں تھامس مان (1875–1955)، ژاں پال سارتر (1905–1980) اور فیودور دوستوفسکی (1821–1881) جیسے بڑے ادیبوں کی تحریروں میں بھی اسی تصور کو مختلف جہات سے اُجاگر کیا گیا۔ فاوسٹ کے کردار میں کبھی انسان عمر بھر بدی میں غرق رہنے کے بعد نیکی کی جانب مائل ہوتا ہے اور کبھی نیکی کے راستے سے بدی کی طرف گامزن ہو جاتا ہے—یہی داخلی کشمکش ممتاز شیریں کے تنقیدی مطالعے میں مرکزِ نگاہ ہے۔ ان کے نزدیک یہ انسانی فطرت کی تہہ در تہہ پیچیدگی کا عکاس ہے۔ ممتاز شیریں نے اپنی تنقید میں ژاں پال سارتر کے فلسفے کو بھی مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ سارتر کے تصور کے مطابق "Man is what he wills" یعنی انسان اپنی مرضی اور ارادے سے اپنی تقدیر کا خود خالق ہے۔ اس تصور کو وہ اپنے ڈرامے The Flies میں مزید واضح کرتے ہیں، جہاں انسان کو روایتی جرم و سزا کے تصور سے آزاد کر کے ایک نئی اخلاقی ذمہ داری سے روشناس کروایا جاتا ہے۔ ایسی ذمہ داری جو نسل در نسل منتقل ہونے والی خونی روایات سے نجات کا پیغام دیتی ہے۔ سارتر کے ڈرامے Altona کے حوالے سے ممتاز شیریں نے اس بات پر بھی روشنی ڈالی کہ کس طرح انسان سیاسی مظالم، اخلاقی انحطاط اور ضمیر کی عدالت کا قیدی بن جاتا ہے۔ یہاں وہ مراکش میں ہونے والے جبر و تشدد اور انسان کی داخلی جنگ کو ایک علامتی پیرائے میں بیان کرتی ہیں۔ اس تنقیدی جائزے سے یہ بات نمایاں ہوتی ہے کہ ممتاز شیریں کے نزدیک انسان محض سماجی و سیاسی اکائی نہیں بلکہ ایک داخلی و اخلاقی وجود بھی ہے جو نیکی و بدی کی مستقل آزمائش میں مبتلا رہتا ہے۔ اور یہی وہ فکری جہت ہے جسے انھوں نے فاوسٹ کے استعارے اور مغربی فلسفیانہ ادب کی روشنی میں نہایت گہرائی کے ساتھ واضح کیا ہے۔[10]

انسانی تصور سے متعلق اپنے تنقیدی بیانیے کو ممتاز شیریں نے اپنے مضمون "منٹو: ایک اخلاقی فنکار" میں مزید وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے انسانی تصور، معاشرتی تقاضوں اور منٹو کی اخلاقیات پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ یہ مضمون ممتاز شیریں نے منٹو کی پندرہویں برسی کے موقع پر قلم بند کیا تھا جس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ منٹو کے فن کو ایک اخلاقی و فکری پس منظر میں دیکھتی ہیں، نہ کہ محض فحاشی یا جذباتیت کے تناظر میں۔ اگرچہ پندرہ برس کا عرصہ کسی ادیب کے مقام کے حتمی تعین کے لیے مختصر سمجھا جا سکتا ہے، لیکن 2023ء تک آتے آتے ممتاز شیریں کا یہ مضمون منٹو کی افسانہ نگاری میں اخلاقیات، انسانی شعور اور ان حساس موضوعات کی بھرپور عکاسی کرتا ہے جنھیں منٹو نے اپنی تخلیقات کی بنیاد بنایا۔ مضمون کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ ممتاز شیریں کے نزدیک منٹو کا فن کسی الہامی سچائی کا محتاج نہیں، اور نہ ہی وہ قاری کو کسی مخصوص فکری نظام کے حوالے کرتا ہے؛ بلکہ وہ زندگی کی سچائیوں کو براہِ راست اور غیر روایتی انداز میں پیش کرتا ہے۔ ابتدائی سطح پر اس مضمون کا مطالعہ قاری کو محض ایک توصیفی تحریر کا تاثر دے سکتا ہے، تاہم کسی بھی تنقیدی متن کی تہہ تک رسائی کے لیے اس کا باریک بینی سے متعدد بار مطالعہ ناگزیر ہے۔ ممتاز شیریں نے اس مضمون میں منٹو کے ان افسانوی متون پر توجہ مرکوز رکھی ہے جو انسانی اخلاقیات، اقدار اور

انفرادی نفسیات پر مبنی ہیں۔ یہ قابل توجہ امر ہے کہ انھوں نے فسادات پر مبنی منٹو کی تحریروں کو اس تنقیدی جائزے کا مرکزی نکتہ نہیں بنایا، بلکہ ان تخلیقات کو موضوع بنایا ہے جو انسان کے باطن، اس کی داخلی کشمکش اور اخلاقی پیچیدگیوں کی نمائندہ ہیں۔ اس طرح، ممتاز شیریں کا یہ مضمون نہ صرف منٹو کی فنکارانہ جہات کا احاطہ کرتا ہے بلکہ اُردو تنقید میں ایک فکری وسعت اور اخلاقی شعور کی نمائندگی بھی کرتا ہے، جو منٹو جیسے متنازع مگر عظیم افسانہ نگار کے حوالے سے ایک متوازن اور بامعنی زاویہ فراہم کرتا ہے۔

ممتاز شیریں نے اپنی تنقیدی تحریروں میں سعادت حسن منٹو کی کہانیوں کے ان متون کو بنیاد بنایا ہے، جو افسانوی مفاہیم کی تہہ در تہہ گہرائی کو آشکار کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک کسی بھی تخلیق کا سطحی مطالعہ اس کے اصل مفہوم کو پوری طرح واضح نہیں کر سکتا، اور یہی وہ نکتہ ہے جو ممتاز شیریں کی تنقید کو امتیازی حیثیت عطا کرتا ہے۔ بطور نقاد انھوں نے منٹو کی تحریروں کا متنی و مفہومی تجزیہ اس انداز سے کیا ہے کہ وہ پوشیدہ معانی کو نمایاں کر سکیں۔ وہ معانی جو عموماً ایک عام قاری کی نگاہ سے اوجھل رہتے ہیں۔ منٹو کے بارے میں عمومی رائے یہی پائی جاتی ہے کہ اس کے افسانے فحاشی سے لبریز ہیں، لیکن ممتاز شیریں اس تاثر کی نفی کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک منٹو کا قلم زندگی کی ان تلخ حقیقتوں کی مصوری کرتا ہے، جو سماجی منافقت، اخلاقی زوال، اور انسانی تجربات کی سخت گیر جہات سے تشکیل پاتی ہیں۔ وہ ان افسانوں کو فحاشی کے بجائے حقیقت کا بے لاگ اظہار یہ قرار دیتی ہیں۔ ایسی حقیقت جو لفظوں کے ذریعے ایک گہری تصویر کی صورت تشکیل پاتی ہے اور جس کے رنگ اگرچہ تلخ ضرور ہیں، لیکن جھوٹے نہیں۔ ان مضامین میں انھی تلخ رنگوں کی فکری تشریح موجود ہے۔ ان کے نزدیک منٹو کی افسانہ نگاری کی اخلاقی معنویت روایتی اقدار کے نمائندہ کرداروں میں نہیں ہے؛ نہ وہ عورت جو چولہے کے سامنے بیٹھی ہے، نہ وہ دوشیزہ جو پلو میں لپٹی ہوئی حیا کا پیکر بنی بیٹھی ہو، اور نہ ہی وہ خیالی کردار جو سفید گھوڑے پر سوار ہو کر نیکی کی علامت بن کر آتا ہے۔ ممتاز شیریں کے مطابق منٹو نے ایسے کرداروں کو موضوع بنایا ہے جو معاشرے کے حاشیے پر جی رہے ہیں۔ وہ کردار جنھیں معاشرہ "گرے ہوئے" کہہ کر رد کر دیتا ہے، لیکن جو در حقیقت انسانی سچائیوں کا سب سے بے باک اور اصلی چہرہ ہوتے ہیں۔ اس تناظر میں وہ لکھتی ہیں:

> "طوائفیں، ان کے گاہک اور دلال، فلمی دنیا کے عیاش مرد اور بدکار عورتیں اور ان سے آباد ان کی پناہ گاہ شہر ممبئی، جو منٹو کا مرغوب اور محبوب شہر تھا۔ بابل اور وینیس اور لارنس ڈرل کے اسکندریہ کی مانند ایک شہر گناہ۔"(11)

کسی بھی فنکار، بالخصوص ایک ادیب کے لیے اس کے فنی سفر کی راہ ہمیشہ ہموار نہیں ہوتی۔ یہ سفر عموماً جدوجہد، تھکن اور انتھک محنت سے عبارت ہوتا ہے۔ ممتاز شیریں نے منٹو کی تحریروں میں بھی ایسا ہی واضح ارتقائی سفر محسوس کیا ہے، جہاں وقت کے ساتھ ساتھ نہ صرف اسلوب میں پختگی آئی بلکہ موضوعات میں بھی گہرائی اور وسعت پیدا ہوئی۔ منٹو

کے افسانے معاشرتی، نفسیاتی اور شعوری پس منظر میں مختلف جہات سے نمو پاتے ہیں۔ ان کے ہاں تبدیلی صرف اندازِ بیان کی نہیں بلکہ فکر اور ادراک کے گہرے دریچوں کی بھی ہے۔ ممتاز شیریں نے منٹو کے افسانے "شغل" کو روسی ادیب گورکی کے معروف افسانے "چھبیس مرد اور ایک لڑکی" سے ماخوذ قرار دیا ہے۔ چونکہ منٹو خود بھی مترجم رہے ہیں، اس لیے یہ ممکن ہے کہ کسی تحریر کا غیر شعوری اثر ان کی تخلیقات میں در آیا ہو۔ تاہم سوال یہ ہے کہ کیا عورت کے استحصال کی کہانیاں صرف برصغیر پاک و ہند تک محدود رہی ہیں؟ یا کیا وہ ممالک جہاں تانیثی تحریکوں کا آغاز ہوا، عورت کے حقوق کی مکمل پاسداری میں ہمیشہ کامیاب رہے؟ یقیناً ایسا نہیں ہے۔ یہ رویہ غالباً ہمارے فکری اور نفسیاتی کمزوری کی علامت ہے کہ ہم اپنے ادیبوں، نقادوں یا فنکاروں کے کام کا جائزہ لیتے ہوئے غیر ضروری طور پر مغرب کے ادبی معیارات سے موازنہ کرتے ہیں، گویا مغربی حوالہ دیے بغیر ہماری تنقید یا تجزیہ نامکمل رہتا ہو۔ ممتاز شیریں کا یہ نکتہ خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ ہمیں مقامی تناظر، ثقافتی سیاق اور تاریخی تجربے کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے تخلیق کاروں کا مطالعہ کرنا چاہیے، نہ کہ ہر تنقیدی پیمانے کو مغرب کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

ممتاز شیریں نے اپنے تنقیدی مضمون میں سعادت حسن منٹو کے ابتدائی دور سے لے کر آخری عہد تک کے افسانوی سفر کا جامع مگر اختصاری جائزہ پیش کیا ہے۔ اس جائزے میں انھوں نے "نیا قانون"، "سورج کے لیے"، "بانجھ"، "ڈرپوک"، "پانچ دن" اور "بابو گوپی ناتھ" جیسے اہم افسانوں کو ان کے موضوعاتی تنوع کے پس منظر میں زیر بحث لایا ہے۔ ان تحریروں کے ذریعے ممتاز شیریں نے نہ صرف منٹو کے تصورِ انسان پر روشنی ڈالی ہے بلکہ وقت کے ساتھ اس تصور میں آنے والی تبدیلیوں اور ان کے رنگ بدلتے زاویوں کو بھی ناقدانہ انداز میں پرکھا ہے۔ مصنفہ کے تنقیدی زاویے کا بنیادی محور یہ ہے کہ انسان کے اصل فطری تقاضے کیا ہیں اور کس طرح یہ تقاضے معاشرتی جبر، سماجی زوال، اور اخلاقی تضادات کے درمیان اپنی صورت گری کرتے ہیں!۔ ان کے لیے انسان کوئی مثالی یا مجرد ہستی نہیں بلکہ ایک ایسا وجود ہے جو خارجی دنیاؤں کے اثرات سے گتھم گتھا ہو کر داخلی کشمکش کا پیکر بن جاتا ہے۔ ان کے مضمون کا متن اس مفہوم کو کچھ اس انداز میں بیان کرتا ہے:

> "راج کشور سے بابو گوپی ناتھ منٹو کے یہ دو افسانے متضاد اہم اور نمائندہ کردار انسان کے دو مختلف تصورات پر دلالت کرتے ہیں اور بابو گوپی ناتھ کے ساتھ ہم اس موڑ پر آتے ہیں جہاں منٹو کے انسان کا تصور بدلا ہے اور منٹو کا فطری انسان کتنی منزلیں طے کرتا اب "نامکمل" انسان بن گیا ہے۔"(12)

اپنے تنقیدی مطالعے میں انھوں نے منٹو کے افسانوی کرداروں کو شیکسپیئر کے المیہ کرداروں "ہملٹ" اور "میکبتھ" سے تشبیہ دی ہے جو ایک دقیق مگر گہرا تنقیدی اشارہ ہے۔ جیسا کہ ہملٹ اور میکبتھ ایک دوسرے کی ضد سمجھے جاتے

ہیں، اسی طرح منٹو کے تخلیق کردہ کردار بھی ایک دوسرے سے فکری، نفسیاتی اور اخلاقی تناظر میں مختلف نظر آتے ہیں اور یہ اختلاف بذاتِ خود کسی خرابی کی علامت نہیں بلکہ انسانی فطرت کی ہمہ گیری اور تنوع کی دلیل ہے۔ مصنفہ نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ اختلاف، انسان کی تخلیقی سرشت کا حصہ ہے نہ کہ کسی منفی رجحان کا مظہر۔ ممتاز شیریں کی تنقید کا مرکزی نکتہ یہی ہے کہ منٹو کے افسانوں میں جنسی انحراف نہیں بلکہ انسانی فطرت کی دوہری ساخت یعنی نیکی اور بدی کا فطری امتزاج نمایاں کیا گیا ہے۔ ان کے نزدیک انسانی جبلت کا انکار، انسان کو اُس کی اصل حقیقت سے محروم کر دیتا ہے۔ انسان کی فطرت میں موجود روشنی اور تاریکی دونوں ادب میں اس کی کامل تصویر گری کے لیے ضروری ہیں۔ اسی تناظر میں اپنی تنقیدی کتاب کا عنوان "منٹو: نوری نہ ناری" رکھا جو منٹو کے انسان کے تصور کی گہری تعبیر ہے۔ ان کے نزدیک منٹو کا انسان نہ کسی مجرد پاکیزگی کا نمائندہ ہے، نہ ہی محض نفسانی خواہشات کا پیکر بلکہ وہ "آدم خاکی" ہے یعنی ایک ایسا انسان جو اپنی خاکی حقیقتوں، جبلتی کشمکش، سماجی جبر اور اخلاقی تضادات کا سامنا کرتا ہے۔ اگرچہ منٹو کی وفات کو سات دہائیاں ہونے کو ہیں اور یہ مدت کسی ادیب کی فنّی عظمت کے حتمی تعین کے لیے شاید ناکافی ہو تاہم یہ وقت ضرور مہیا کرتا ہے کہ ہم اس کے فن کو اپنے تعصبات، اخلاقی تنگ نظری اور سماجی مصلحتوں سے ہٹ کر خالص ادبی پیمانے پر پرکھ سکیں۔ آج جب ہم منٹو کو دوبارہ پڑھتے ہیں تو ممتاز شیریں کی بات دہرائے جانے کے قابل صداقت بن جاتی ہے۔ ایک ایسا فکری اظہار جو آج بھی اپنی معنویت برقرار رکھے ہوئے ہے۔

منٹو مداح تو غالب کا تھا لیکن اس نے اپنی تحریروں میں پیروی میر تقی میر کی کی ہے۔ وہ یوں کہ اس نے میر کی طرح بے تحاشا لکھا۔ لکھا تو غالب نے بھی بے تحاشا ہو گا لیکن اس نے اپنی زندگی میں اپنے کلام کا انتخاب کر لیا تھا جس کی وجہ سے ہمیں اس کے کلام میں وہ ناہمواری نظر نہیں آتی جو میر کا خاصا ہے۔ منٹو نے بھی میر کی طرح بے پناہ لکھا۔ اس نے کئی تحریریں محض پیسے کے حصول کے لیے لکھیں۔ ظاہر ہے جب آپ کسی مادی ضرورت کے تحت لکھتے ہیں تو معیار برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر اسے زندگی نے بھی انتخاب کی مہلت نہ دی جس کی وجہ سے اس کی تحریروں میں بہت زیادہ ناہمواری ہیں۔ اگرچہ منٹو کی بعض تحریریں فکری و فنی اعتبار سے اس قدر بلند مقام رکھتی ہیں کہ انھیں دنیا کی کسی بھی عظیم زبان و ادب کے شاہکاروں کے ساتھ رکھا جا سکتا ہے، وہیں اس کے بعض دیگر افسانے ایسے بھی ہیں جو معیار اور اثر پذیری کے اعتبار سے کمزور محسوس ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ "ٹھنڈا گوشت" اور "کالی شلوار" منٹو کے ہی نہیں اُردو کے بھی اہم افسانوں میں شمار ہوتے ہیں لیکن "ٹوبہ ٹیک سنگھ" اور "نیا قانون" مذکورہ بالا افسانوں سے بھی کہیں زیادہ اہم ہیں جو نہ صرف یہ کہ جنس کے گرد نہیں گھومتے بلکہ اس میں کسی عورت کا ذکر تک نہیں۔ ممتاز شریں نے منٹو کے ایسے افسانوں کے تناظرات کو اپنے ایک ناتمام مضمون "بنیادی گناہ: جنس" میں موضوع بنایا ہے۔ مضمون دراصل عزیز احمد کے مشہور زمانہ مضمون "ترقی پسند ادب" کا جواب ہے۔ اپنے اس نامکمل مضمون میں

انھوں نے عزیز احمد کی طرف سے سعادت حسن منٹو، محمد حسن عسکری اور عصمت چغتائی پر اٹھائے جانے والے اعتراضات کا جائزہ لیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ انھوں نے جو اعتراضات ان تینوں پر اٹھائے ہیں ان کی اپنی تحریریں بھی اس کی زد میں آتی ہیں۔

حواشی و حوالہ جات

1۔ قاضی افضال حسین، تحریر اساس تنقید، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص19

2۔ ایضاً، ص20

3۔ ایضاً، ص20

4۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، متن، سیاق اور تناظر، پورب اکادمی، اسلام آباد، 2012ء، ص15

5۔ اسٹیفن پاپ، بہ حوالہ ناصر عباس نیر، متن، سیاق اور تناظر، ص5

6۔ ایضاً، ص33

7۔ عابد علی عابد، پروفیسر، اصولِ انتقادِ ادبیات، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1997ء، ص115

8۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر (مترجم)، ارسطو سے ایلیٹ تک، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، 1985ء، ص17

9۔ ممتاز شیریں، منٹو نوری نہ ناری، مکتبہ اسلوب، کراچی، 1985ء، ص22

10۔ ایضاً، ص134

11۔ ایضاً، ص142

12۔ ایضاً، ص55

References in Roman Script:

1. Qazi Afzal Hussain, Tahreer Asaas Tanqeed, Educational Book House, Aligarh, P. 19
2. Ibid., P. 20
3. Ibid., P. 20
4. Nasir Abbas Nayyar, Matan Siyaaq aur Tanazur, Poorab Academy, Islamabad, 2012, P. 15
5. Stephen Popp, Bahwala Nasir Abbas Nayyar, Matan Siyaaq aur Tanazur, P. 5
6. Ibid., P. 33
7. Abid Ali Abid, Professor, Usool-e-Intiqad-e-Adabiyat, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 1997, P. 115
8. Jameel Jalibi, Dr.,(Translator), Arastu se Eliot tak, National Book Foundation, Islamabad, 1985, P. 17
9. Mumtaz Shirin, Manto Noori Na Naari, Maktaba Asloob, Karachi, 1985, P. 22
10. Ibid., P. 134
11. Ibid., P. 142
12. Ibid., P. 55